۸ جولائی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۷

اس شمارے میں

۱- اداریہ ۱
۲- پریم چند کا مکتوب
قمر رئیس ۳
۳- غزل
اقبال افضل ۳
۴- بین کی ڈائری
برہم ناتھ دت ۴
۵- مولانا عبدالباری آسی
امیر حسن نورانی ۵
۶- مراسلات ۷
۷- اخبار و افکار ۹
۸- تبصرے
ڈاکٹر محمد انصار اللہ
عتیق احمد صدیقی ۱۲

آل احمد سرور

تسکین قریشی

چند روز ہوئے حضرت مسکین اکبرآبادی کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۲۲ جون کو آگرے میں تسکین قریشی صاحب کا کینسر کے عارضے میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔

تسکین قریشی صاحب سوروں کے رہنے والے تھے۔ پولیس میں ملازمت کرکے چودہ پندرہ سال پہلے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انجینیری اور پولیس میں دیانت کا معیار عام معیار سے مختلف ہے، مگر تسکین صاحب نہایت ایماندار اور فرض شناس آدمی تھے۔ جہاں رہے نیک نام رہے۔ شاعری کا چسکا شروع سے تھا، حضرت عزیز لکھنوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ جگر مرادآبادی سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ بلاشبہ ان چند اشخاص میں جو جگر کے آخری بیس پچیس سال کے خلوت و جلوت کے ساتھی، ہمدم اور ہمراز اور بے تکلف دوست تھے، تسکین صاحب سب سے ممتاز تھے، وہ جگر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے اور جب جگر صاحب کے لاابالی پن کی وجہ سے کبھی تسکین صاحب ان سے خفا ہو جاتے تو جگر صاحب طرح طرح سے ان کو مناتے۔ تسکین صاحب خط و کتابت کے معاملے میں باقاعدگی پسند کرتے تھے، پروگرام بن جائے تو اس پر عمل ضروری جانتے تھے، معاملات میں صاف گوئی کے قائل تھے۔ یہ سب جگر صاحب جیسے شاعر کے بس کی باتیں نہ تھیں۔ اس لئے کبھی دونوں میں خوب نوک جھونک ہوتی تھی، مگر دونوں کی ایک دوسرے سے محبت مثالی تھی۔ جب جگر صاحب نے مرنے سے کچھ پہلے اپنے کلام سے آمدنی کے سلسلے میں ایک وصیت نامہ مرتب کیا تو اس کا ٹرسٹی تسکین صاحب کو بنایا۔ جگر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خطوط، بیاضوں اور دیگر اشیاء کو محفوظ کرنے کے لئے تسکین صاحب نے پہلے مولانا آزاد لائبریری میں گوشۂ جگر کی تجویز پیش کی۔ جب یہاں کسی وجہ سے انتظام نہ ہو سکا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انھوں نے گوشۂ جگر قائم کرایا جہاں جگر صاحب کی بہت سی چیزیں محفوظ ہیں۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ تسکین صاحب سے سب سے پہلے کب ملاقات ہوئی۔ جب میں رام پور میں تھا تو جگر صاحب دو دفعہ مشاعروں کے سلسلے میں تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر قیام کیا۔ انھوں نے

اس وقت تسکین صاحب کی بڑی تعریف کی تھی۔ اور ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار بھی اپنے مخصوص ترنم میں سنائے تھے۔ تسکین صاحب کسی وجہ سے رام پور نہ آسکے تھے۔ جب میں سنہ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ پہنچ گیا تو جگر صاحب سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔ وہ جب بھی لکھنؤ آتے میرے یہاں ضرور قدم رنجہ فرماتے۔ ایک دفعہ تسکین صاحب بھی ان کے ساتھ تھے جو اس زمانے میں لکھنؤ میں پولیس میں انسپکٹر تھے۔ میں اس زمانے میں پان تو کھاتا تھا مگر تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ جگر صاحب نے قوام کی ایک شیشی نکالی، تھوڑا سا قوام ایک پان میں لگایا اور یہ کہہ کر کہ یہ بہت ہلکا اور بے ضرر ہے اور ہمارے تسکین صاحب نے خود تیار کیا ہے، مجھے پیش کیا، میں نے کھایا تو ذائقہ خوشگوار معلوم ہوا۔ جگر صاحب ایک شیشی چھوڑ گئے۔ میں نے جب کہا کہ میں تو قوام کھاتا نہیں اس کا کیا ہوگا تو کہنے لگے پڑا رہنے دیجئے۔ اب میں کبھی کبھی کھانے لگا۔ چونکہ اس میں تمباکو واقعی بہت کم ہوتی تھی اس لئے کھانے میں تکلف بھی نہ ہوا۔ مگر عادت پڑتی گئی، جب ایک شیشی ختم ہوگئی تو تسکین صاحب دوسری دے گئے جب یہ بھی ختم ہوگئی تو مجبوراً بازار سے قوام منگوایا۔ میری پان اور تمباکو کی عادت گویا تسکین صاحب اور جگر صاحب کی مشترکہ سازش کا نتیجہ ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ہال میں پناہ گزینوں کی امداد کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں فراق اور جگر دونوں شریک تھے۔ تسکین صاحب بھی تھے اور ان کی قوام کی شیشی بھی۔ جگر صاحب نے تسکین صاحب کا کلام سنایا تھا۔ اس غزل کے چند اشعار اب تک یاد ہیں۔

کچھ اور پوچھئے یہ حقیقت نہ پوچھئے
کیوں آپ سے ہے مجھ کو محبت نہ پوچھئے

سجدہ دل سے طے مقام محبت نہ ہو سکا
کیا کیا ہوئی ہے سر کو ندامت نہ پوچھئے

ہے راز ابتدائے محبت بس اک نگاہ
ایسی نگاہ جس کی حقیقت نہ پوچھئے

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیال یار
لیکن خیال یار کی وسعت نہ پوچھئے

دونوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں
اب قصۂ مجاز و حقیقت نہ پوچھئے

تکمیل الطب کالج کے مشاعرے میں اور لکھنؤ کے کچھ اور مشاعروں میں بھی جہاں دونوں موجود تھے۔ جگر صاحب نے تسکین صاحب کی غزل پڑھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے جگر صاحب نے فانی اور تسکین کے علاوہ کسی اور کی غزل مشاعرے میں نہیں پڑھی۔ ہاں ایک دفعہ مرادآباد کے ایک مشاعرے میں آنند نرائن ملا کی غزل وہ پڑھنا چاہتے تھے، مگر ملا صاحب کو اپنا ترنم اتنا پسند ہے کہ کسی دوسرے کے ترنم کو برداشت نہیں کر سکتے۔

جب 'آتش گل' کا دوسرا ایڈیشن پریس کے لئے تیار ہو رہا تھا تو تسکین صاحب چاہتے تھے کہ جگر صاحب کچھ اشعار پر نظر ثانی کرلیں۔ جگر صاحب باوجود تسکین سے محبت کرنے کے اور ان کی سخن فہمی کے قائل ہونے کے اپنے جگر پاروں کی قربانی کے لئے آمادہ نہ تھے۔ معاملہ بالآخر میرے سپرد ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا تو تسکین صاحب کی مجوزہ ترمیمات فنی نقطۂ نظر سے بہتر تھیں۔ جگر صاحب نے میری خاطر ان میں سے چند قبول کرلیں مگر بیشتر کے معاملے میں وہ خاصے ضدی ثابت ہوئے۔ میں بہرحال تسکین صاحب کی نظر کا قائل ہوگیا۔

تسکین صاحب پرانی وضع کے آدمی تھے۔ ان میں گہری مذہبیت تھی۔ فارسی، اردو شعر و ادب کی کلاسیکی روایت کے دلدادہ تھے۔ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ آدمی نہایت خوددار اور وضع دار تھے۔ شاعر ہونے کے باوجود زندگی کے معاملات میں باقاعدگی کو پسند کرتے تھے، اگر ان کے خط کے جواب میں دیر ہو جاتی تو آزردہ ہو جاتے مگر پھر من جاتے۔ متاع تسکین اور گلگونہ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ خطوط جگر بھی انھوں نے مرتب کئے تھے۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ صرف شاعری اور احباب کی خاطر جیتے تھے۔ خط نہایت پاکیزہ تھا سال بھر ہوا میرے لئے تہذیب الاخلاق کی ایک جلد تحفے کے طور پر بھجوائی تھی۔ ان کی ایک اور غزل کے چند اشعار اپنی بیاض سے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

ہم ان میں کوئی ادا زندگی کی پا نہ سکے
ترے خیال کو جو زندگی بنا نہ سکے

تری نگاہ سے کیا جانے کیوں چھپا نہ سکے
وہ دل کے راز جو دل سے زباں تک آ نہ سکے

مجھے عزیز سہی خاک دل مگر یہ کیا
ہمیں نہ آگ لگائی ہمیں بجھا نہ سکے

ہمیں بھی یاد ہیں مہر و وفا کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا کو ہم سنا نہ سکے

گناہ غم کو غنیمت سمجھ کہ اس کے بغیر
بڑے بڑے بھی فریب حیات پا نہ سکے

وہ کیا کریں گے مداوائے درد دل تسکیں
جو اک نگاہ محبت کی تاب لا نہ سکے

تسکین صاحب کے کلام میں پختگی بھی تھی، درد کیفیت بھی شگفتگی بھی اور تازگی بھی افسوس ہے کہ انھیں وہ شہرت نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اچھے رسالوں میں ان کا کلام ضرور چھپتا تھا، مگر مشاعروں میں کم ہی شرکت کرتے تھے۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اپنی وضع خوب نبھا گئے۔ خدا ان کی تربت کو نور سے معمور کرے۔

قمر رئیس (تاشقند)

پریم چند کا مکتوب

پروفیسر مسعود حسین خاں کے نام

مجی و مکرمی پروفیسر صاحب۔ تسلیم

'ہماری زبان' میں آپ کے دو صفحے (ایک ۱ دسمبر ۱۹۷۰ء کو اور دوسرا ۸ مئی ۱۹۷۱ء کو) میری نظر سے گزرے جن میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے ناول 'گئو دان' کا شمار اردو کے ناولوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ محض ایک ترجمہ ہے۔

برادرم! اس سلسلہ میں یوں تو مجھے اپنی زبان میں بہت کچھ کہنا ہے لیکن اس وقت اختصار کے ساتھ صرف چند باتیں عرض کروں گا۔ سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کروں گا کہ کیا آپ نے میرے ان ناولوں کے اصل مسودے دیکھے ہیں جو اردو میں شائع ہوئے یا جن کے بارے میں منشی اقبال ورما سحر نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کو انھوں نے 'ہندی سے اردو میں لکھا'۔ آپ نے دیریندر پرشاد سکسینہ صاحب کے حوالے سے ان کی خود نوشت کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں منشی صاحب موصوف نے میرے ناول پریم آشرم یعنی 'گوشۂ عافیت' کو بھی ہندی سے اردو میں منتقل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں ان کے دعوے کی تردید نہیں کرتا کہ یہ کام محقق کا ہے۔ صرف آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ ناول اصلاً اردو زبان اور اردو رسم الخط میں لکھا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو میرے وارثوں کے پاس اس کا اصل مسودہ دیکھ سکتے ہیں۔

اردو اور ہندی کے بارے میں آپ میرے مسلک اور میری ان حقیر کوششوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو میں نے ان دو زبانوں کو قریب لانے کے سلسلہ میں کیں۔ اس کے لئے مجھے قربانیاں بھی دینی پڑیں۔ دونوں طرف سے معتوب ہوا۔ اسی کے نتیجہ میں میرے اسلوب تحریر میں وہ ہمواری اور حسن تناسب پیدا نہ ہو سکا جو میرے بعض معاصرین کا حصہ ہے۔ ہندی والوں کا ایک گروہ تو اب تک میری زبان کو ہندی کی معیاری زبان تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ شاید اس لئے کہ اس میں سے اردو کے صدہا محاورے ضرب الامثال اور اظہارات کھپ گئے۔ اس کے باوجود ہندی والے شاید اتنے وسیع القلب ہیں کہ میرے ان چار پانچ ناولوں اور ان گنت کہانیوں کو، جو اردو سے ہندی میں منتقل ہوئیں، ہندی سے جلا وطن نہیں کرتے یعنی ترجمہ قرار نہیں دیتے۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اردو میری مادری زبان اور میرا اولین ذریعہ اظہار رہی ہے۔ آپ سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ میں نے ہندی میں کب کیوں اور کن حالات میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اردو کو ہمیشہ عزیز رکھا۔ بھارتی ساہتیہ پریشد کے ناگپور والے اجلاس میں میں نے ہندی ہندوستانی کے سلسلہ میں مہاتما گاندھی کی تجویز کی کھل کر مخالفت کی تھی۔ میں اپنی منفرد اور مشترکہ زبان ہندوستانی کے لئے ہمیشہ دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں کا حامی رہا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ زندگی کے آخری بارہ برسوں میں بعض حالات اور ضرورتوں کی بنا پر میں نے اپنی زیادہ تر تصانیف اولاً ہندی یا ہندی رسم الخط میں لکھیں۔ لیکن میں اردو کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہا۔ ۱۹۳۶ء میں جب مدیر 'ساقی' نے اپنے رسالہ میں شکوہ کیا کہ 'میں اردو کے لئے مرحوم ہو چکا ہوں' اور اس کا ذکر جامعہ ملیہ کے پروفیسر محمد عقیل نے مجھ سے کیا تو میں نے ان سے کہا تھا

"ساقی کے اڈیٹر کو میں نے لکھا ہے کہ میں اردو

اعجاز افضل

غزل

خلوتِ مفہوم میں ظلمت کی دلداری کرو
محفلِ الفاظ میں اظہار بیزاری کرو

سنگ و شیشہ میں تصادم ہے نہ خاد سر کی خیر
دور سے تجزیۂ مستی و ہشیاری کرو

رات ہو تو چاندنی کے پاؤں دھو دھو کر پیو
دن چڑھے تو دھوپ سے عہد پرستاری کرو

مان لیں گے بار شوریدہ سرانِ خستہ تن
سنگ اندازی سے بچ نکلیں تو گلباری کرو

پی کے پھولوں کا لہو بھونرے نہ اڑ جائیں کہیں
فصلِ گل جاتی ہے اعلانِ گرفتاری کرو

میری بے سمتی ہے میرا مرکزِ فکر و نظر
غیر جانب دار ہوں میری طرفداری کرو

خستگی پھیلا رہی ہے شام کی چادر میں پاؤں
مقتضی ہے رہبری چلنے کی تیاری کرو

روشنی کے دوست ہو تو گرمجوشی بھی دکھاؤ
سر پہ رکھ کر آگ پیمانِ وفاداری کرو

ہو سراپا زخم تو ہنستے رہو رستے رہو
چارہ سازوں کا ادا حق نمک خواری کرو

زیست نادانستگی کی چوٹ سہہ سکتی نہیں
خواہ دلجوئی کرو چاہے دل آزاری کرو

کے لیے نہ صرف زندہ ہوں بلکہ زیادہ زوروں سے جی رہا ہوں میرے دو ایک ناولوں کو چھوڑ کر جن کا میں جلد ہی اردو اڈیشن شائع کرنے والا ہوں میرے تمام ناول اور کہانیاں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا ہندی ترجمہ کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا اردو ترجمہ کرکے شائع کراتا ہوں۔"

(منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے ص ۵۵ سنہ ۱۹۸۲ء)

اسی طرح میں نے اپنے ایک دوست حسام الدین غوری کے نام ایک خط میں ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا۔

"میری دو کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے چھپ رہی ہیں۔ ایک کا نام 'میدان عمل' دوسری کا نام 'واردات' ہے۔ تیسری زیر تصنیف ہے۔"

مذکورہ کتاب ص ۵۰ یہ زیر تصنیف کتاب 'گئودان' تھی جو افسوس ہے کہ میری موت کے بعد شائع ہو سکی۔ آپ نے لکھا ہے۔

"پریم چند نے اپنی ہندی ناولوں کو اردو میں منتقل کرتے وقت سحر صاحب سے مسلسل مدد لی ہے۔"

مجھے انکار نہیں کہ عدیم الفرصتی اور طویل علالت کی وجہ سے میں اس کام میں سحر صاحب اور دیگر دوستوں سے مدد لیتا تھا لیکن کسی کام میں دوستوں سے مدد لینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کام کو دوستوں کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جائے۔ میں اپنی کتاب کے اردو اڈیشن کے مسودہ پر نظر ثانی بھی کرتا تھا۔ کیا اس امکان پر آپ کی نظر نہیں گئی کہ میں اپنے دوستوں کو بٹھا کر اپنی ہندی کتابوں کو اردو میں DICTATE بھی کرا سکتا تھا۔ میں بہرحال اپنی تمام اردو مطبوعات کو اپنی تصنیف ہی مانتا آیا ہوں، ترجمہ نہیں۔ فرض کیجئے آپ اپنی کسی انگریزی کتاب یا مقالہ کو اردو میں منتقل کریں اور اس عمل میں مناسب اور ضروری ردوبدل بھی کریں اور پھر اسے اپنے نام سے اپنی تصنیف کے طور پر شائع کرائیں۔ تو کیا محض اس بنا پر کہ آپ نے اس کام میں کسی دوست سے مدد لی آپ کی اردو کتاب یا مقالہ کو ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس موضوع پر لکھی گئی کسی نادر اردو کتابوں کی تاریخ میں اس کا ذکر جائز ہوگا؟ میری دانست میں یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ پھر میرا معاملہ انگریزی اردو کا نہیں بلکہ ہندی اور اردو کا ہے۔ جن کو میں (صحیح یا غلط) اساسی طور ایک ہی زبان مانتا آیا ہوں اور اس پر اصرار کرتا رہا ہوں کہ دونوں زبانوں میں میری کتابوں کو تصنیف ہی مانا جائے۔ ویسے اگر آپ اس اصولِ تحقیق کو جاری رکھنے پر اصرار کریں گے تو میرا خیال ہے کہ نوطرز مرصع اور باغ و بہار سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال" تک اور نیرنگ خیال سے پروفیسر وحید مرزا کی اردو تصنیف 'امیر خسرو' تک اردو کی بیسوں کتابوں کو تصانیف کی فہرست سے خارج کرکے تراجم کی فہرست میں شامل کرنا ہوگا۔ میری باری تو شاید سب سے آخر میں آئے گی۔

نیازمند احقر
پریم چند

▲

پریم ناتھ دت   درگوید ۷-۵-۹

بن کی دیوی

(۱) بن کی دیوی! آنکھوں سے اوجھل رہنے والی!
تو بستیوں سے دور کیوں رہتی ہے؟ کیا تجھے ڈر نہیں لگتا؟

(۲) جھینگر جب اونچی آواز میں تان اڑاتا اور ٹھنڈا اثر پھیلاتا ہے تو جا بجا جھن کی جھنکار کا سماں بندھ جاتا ہے اور تو بار بار باغ باغ ہو جاتی ہے۔

(۳) ذرا دور جہاں ڈھور ڈنگر چر رہے ہیں، ایک پڑاؤ دکھائی دیتا ہے سورج کے ڈھلتے ہی جنگل کی رانی وہاں سے اپنا تسلط اٹھا لیتی ہے۔

(۴) معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا مارا کوئی راہی چیخ اٹھا ہے چرواہا اپنے مویشیوں کو اور لکڑہارا لکڑیاں اٹھائے بھاگا بھاگ گھر کی راہ لیتا ہے۔

(۵) بن کی دیوی کسی کو گزند نہیں پہنچاتی، درگزر کرتی ہے لوگ اس کے لذیذ پھل کھاتے ہیں جتنے چاہیں لے بھی جاتے ہیں اور اس کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔

(۶) بن کی سندری کی تعریف میں کیا کہوں، وہ معطر ہے معنبر ہے مرہم شفا ہے، دلکش نغموں کا منبع ہے، ہرچند پل نہیں چلاتی، پھر بھی اشیائے خوردنی کی اس کے ہاں کمی نہیں۔

امیر حسن نورانی

مولانا عبدالباری آسی
کی ادبی خدمات

مولانا آسی مرحوم نے اردو زبان و ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور اچھے انشا پرداز و مترجم کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے، فارسی ادبیات میں بڑی مہارت رکھتے تھے عربی اور اسلامی علوم سے بھی واقف تھے اسے زمانہ کی ستم ظریفی کہیے یا ادبی دنیا کی غفلت کہ آسی مرحوم کی خدمات کا نہ تو اعتراف کیا گیا اور نہ ان کے علمی و ادبی کارناموں کی طرف اہل قلم نے توجہ کی، حالانکہ ان سے کہیں کمتر درجہ کے ادیبوں اور شاعروں پر بہت کچھ لکھا گیا، خود آسی صاحب شہرت و ناموری سے بے نیاز رہ کر عرصہ دراز تک ٹھوس علمی خدمات انجام دیتے رہے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ مطبع نولکشور کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں گزرا، جہاں انھوں نے فارسی کی متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اردو فارسی کے بلند پایہ شعرا کے کلیات و دواوین کی صحت و ترتیب میں بڑی عرق ریزی کی جس کا ثبوت، کلیات میر تقی میر، کلیات نظیر اکبر آبادی اور کلیات سودا ہیں، فارسی سے گلستان سعدی اور خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقین کے اردو ترجمے بے حد مقبول ہوئے، لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ آسی مرحوم نے ان کاموں کے علاوہ بعض نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں ان میں ایک فرہنگ آنند راج کا مکمل اردو ترجمہ ہے یہ فارسی کا مستند اور ضخیم لغت ایران میں بہت مقبول ہے اور اس کے کئی اڈیشن وہاں سے شائع ہو چکے ہیں اردو ترجمہ آسی صاحب نے کافی مدت میں کیا اور ساتھ ساتھ اصل لغت کی صحت بھی کرتے گئے اس کی کتابت و طباعت کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۵۰ء میں مطبع نولکشور کے وارثوں میں باہمی نزاع کے باعث یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ تا حال اس لغت کا مسودہ وارثان مطبع کے پاس محفوظ ہے۔ آسی مرحوم کا دوسرا عظیم کام تذکیر و تانیث کا جامع لغت ہے، جس کا علم مجھ کو جناب احمد ابراہیم علوی کے مضمون سے ہوا جو ہماری زبان مورخہ یکم جون میں شائع ہوا اور عزیز موصوف کا مضمون ہی ان سطور کی تحریر کا سبب بنا۔ حالانکہ آسی صاحب کی ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھنے کا خیال عرصہ سے ہے اور اس سلسلہ میں کافی معلومات بطور یاد داشت میرے پاس موجود ہیں۔

میرا خیال ہے کہ تذکیر و تانیث کا یہ جامع لغت نہایت اہتمام سے شائع ہونا چاہئے اس سے اردو ادب کی ایک اہم ضرورت پوری ہوگی اور علمی دنیا اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔ یہ کام انجمن ترقی اردو یا ترقی اردو بورڈ کو انجام دینا چاہئے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے اور ارباب دانش اس گرانقدر مسودہ کو شائع کرانے کی جد وجہد میں دلچسپی لیں گے یہ ایک ایسا کام ہے جس کو پورا ایک بورڈ مل کر کرتا تب بھی تکمیل کے لئے مدت درکار تھی۔ جس کو ایک فاضل ادیب و شاعر نے تن تنہا محنت و جانفشانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ محض زبان و ادب کی خدمت کے خیال سے۔ اس سلسلہ میں حکومت اتر پردیش کو بھی توجہ دلائی جا سکتی ہے، احمد ابراہیم صاحب نے اس کے متعلق جو اپیل اہل علم سے کی ہے واقعی اس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

▲

مراسلات

فانوس کی تذکیر و تانیث کے بارے میں

"اردو کی ایک نادر قلمی لغت" کے عنوان سے احمد ابراہیم علوی صاحب کا ایک مضمون "ہماری زبان" میں شائع ہوا ہے۔ اس میں فانوس کی تذکیر و تانیث پر جو بحث کی گئی ہے اس تعلق سے چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ بیان و حقائق کے کچھ اور گوشے بھی روشنی میں آجائیں۔ مضمون کے ابتدائی حصہ میں مولانا عبدالباری آسی کے اس قلمی لغت کا سنہ تصنیف ۱۹۴۰ء بتایا گیا ہے اور اس تالیف کے قبل تذکیر و تانیث پر لکھی گئی کتابوں میں مفید الشعرا، ارمغان اور چکیدہ اور معین الشعرا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"نور اللغات، فرہنگ آصفیہ اور امیر اللغات میں تذکیر و تانیث کا ذکر ہے مگر اس پر مدلل اور مفصل بحث ان کے دائرۂ اختیار سے باہر تھی کہ ان کا کام الفاظ کے معنی بتانا تھا ان کی ساخت اور طریقۂ استعمال پر زور دینا کم۔"

امیر اللغات کے تعلق سے یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ امیر مینائی کا یہ لغت نامکمل رہ گیا ہے۔ اس کی صرف دو جلدیں ہی شائع ہو سکی ہیں اس لئے ایک تو یہاں اس لغت کا ذکر بلا ضرورت ہے دوسرے یہ کہ جہاں تک اس لغت کی جامعیت کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معنی بتانے کے علاوہ لفظ کے ہر پہلو پر بحث اس کے دائرۂ اختیار میں تھی۔ اگر یہ لغت پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو پھر اردو میں نہ صرف کوئی لغت کی بات اٹھتی بلکہ اس قبیل کی کسی تصنیف پر قلم اٹھانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ ہر لفظ کے ساتھ زبان، ساخت، تذکیر و تانیث، معنی، طریقۂ استعمال، شعرا اور مستند مع نام مصنف موجود ہے اور جہاں کہیں اختلاف ہے اس کی تشریح کے ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی دی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ آغوش کی تذکیر اور تانیث دونوں کے ثبوت میں رند و آتش کے اشعار درج کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے کہ شعرا نے مذکر بھی کہا ہے اور مونث بھی استعمال کیا ہے مگر مولف کے نزدیک اس کی تذکیر کو ترجیح ہے۔ افسوس کہ الف ممدودہ اور مقصورہ سے آگے یہ کام نہ بڑھ سکا اور اردو الفاظ سے متعلق بہت کچھ تشنگی باقی رہ گئی۔ اس تشنگی کا احساس جناب جلیل کو سب سے پہلے ہوا کیونکہ امیر مینائی کی زندگی ہی میں رامپور میں امیر اللغات کو اپنی آنکھوں کے سامنے انھوں نے دم توڑتا ہوا دیکھا تھا یہی باعث ہوا "تذکیر و تانیث" کی تالیف کا جو ۱۳۳۶ھ میں مولانا عبدالحلیم شرر کے ریویو کے ساتھ شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اور بالالتزام اشعار سے سند دی گئی ہے۔ نظیر میں وہی شعر لیا گیا ہے جس کی ردیف یا قافیہ تذکیر و تانیث کو ثابت کرتا ہے جن الفاظ کی جنس میں اختلاف ہے تحقیق کے ساتھ صراحت کر دی ہے اور اپنی رائے بھی دیدی ہے۔

جلیل کی یہ کتاب عبدالباری آسی کی کتاب سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اسی نوع کی تالیف کے وقت جناب آسی نے اس کو پیش نظر نہ رکھا ہو۔ حیرت ہے کہ مضمون نگار نے دوسری کتابوں کی بات تو کہی ہے لیکن اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"چونکہ اردو کی جملہ لغات میں نور اللغات کو ہی مستند تصور کیا جاتا ہے اور تذکیر و تانیث کے سلسلے میں مولانا کے عہد تک جلال کی مفید الشعرا اور معین الشعرا مولفہ آغا فانی بنارسی مقبول تھی۔ اسی لئے مولانا نے انھیں لغات کو عموماً پیش نظر رکھا ہے اور انھیں کے اغلاط کی طرف جا بجا اشارہ کیا ہے۔"

لطف یہ کہ آگے چل کر فانوس کی تذکیر و تانیث کی جہاں بحث چھیڑی ہے وہاں اس کا ذکر موجود ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

"اس کے بعد مولانا آسی نے اقتباس کے تحت لکھا ہے۔ مولف نور اللغات نے لکھا ہے کہ فانوس بالاتفاق مذکر ہے مگر برق لکھنوی نے خلاف جمہور مونث کہا ہے اور یہ مستبعد ہے جلیل کی اس تحریر کا جو انھوں نے اپنی 'تذکیر و تانیث' کے رسالہ میں درج فرمایا ہے کہ مذکر ہے اور لطف یہ کہ مذکر لکھ کر سند میں بحر کا یہ شعر درج کیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

کی تجلی میں کہوں اس ساعد پر نور کی
آستین یار ہے فانوس شمع طور کی"

نہ جانے یہ شعر کہاں سے نقل کیا گیا ہے۔ اصل رسالہ میں اس کا کہیں پتہ نہیں کیونکہ "تذکیر و تانیث" مطبوعہ اختر دکن پریس حیدرآباد جو اس وقت میرے پیش نظر ہے اس کے صفحہ ۲۴۵ پر یوں درج ہے۔

"فانوس۔ مذکر۔ بحر

طبیعت بحر کی روشن ہوئی جب وصف ابرو سے
ہوا فانوس مصراع مہ نو شمع مضمون کا

برق نے مونث بھی کہا ہے مگر اتفاق مذکر پر ہی ہے۔"

مولانا آسی نے اپنے قلمی لغت میں فانوس کو مختلف فیہ قرار دیا ہے اور مذکر کی سند میں سحر کا وہی شعر لکھ دیا ہے جسے جلیل نے اپنی تذکیر و تانیث میں درج کیا ہے یعنی

طبیعت سحر کی روشن ہوئی جب وصف ابرو سے
ہوا فانوس مصراع مہ نو شمع مضموں کا

فانوس کے مختلف فیہ ہونے کی تائید و دلیل میں احمد علوی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اب مولف نور اللغات اور حافظ صاحب (جلیل) کے اس فقرہ پر غور فرمایئے کہ برق نے خلاف جمہور کہا ہے۔ غور فرمایئے اول تو برق کا شعر تانیث کے ثبوت میں ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو مندرجہ شعر اور بھی تانیث کے ثبوت میں ہیں۔"

جلیل نے اپنی کتاب میں برق کا شعر مونث کے ثبوت میں لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ علاوہ ازیں ان کے اس فقرے کے 'کہ برق نے مونث بھی کہا ہے' یہ معنی تو نہیں ہوتے کہ اور کسی نے مونث نہیں کہا ہے۔ جلیل نے یہ نہیں لکھا کہ "برق نے مونث کہا ہے' جو خلاف جمہور ہے" یہ نتیجہ تو مولف نور اللغات کا نکالا ہوا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بجز جلال مرحوم کے کسی نے فانوس کو صرف مونث قرار نہیں دیا۔ اساتذہ کی اکثریت نے بطور مذکر ہی استعمال کیا ہے اس لئے جلیل نے بجائے یوں کہنے کے کہ میں مذکر استعمال کرتا ہوں یا میں مذکر کو ترجیح دیتا ہوں بہت ہی محتاط انداز میں لکھا ہے کہ اتفاق مذکر پر ہی ہے۔ یہ رائے اتنی جامع ہے کہ اس کے بعد فانوس کی تذکیر و تانیث پر مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

محبوب نگر ● علی احمد جلیلی

وزارت داخلہ کا لینگویج اسٹیٹمنٹ اور دلی انتظامیہ

یا دش بخیر، بڑی کد و کاوش کے بعد ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو وزارت داخلہ نے ایک لینگویج اسٹیٹمنٹ جاری کیا تھا جس سے کچھ امید بندھی تھی کہ اب اردو والوں کی جائز شکایتیں ایک حد تک دور ہو جائیں گی اور اس زبان کے رفتہ رفتہ اپنے وطن ہی میں اجنبی بنتے جانے کے جبری عمل پر کچھ بندشیں لگ جائیں گی۔ مگر اسے اردو زبان کی کم نصیبی کے سوا کیا کہا جائے کہ اس بارے میں ہر امید ناامیدی میں بدل جاتی ہے اور ہر خوشگوار کارروائی ایک ناخوشگوار تعطل اور جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وزارت داخلہ کے اس لینگویج اسٹیٹمنٹ پر دلی ایڈمنسٹریشن میں عمل درآمد شروع ہونے میں پورے دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ اور مسلسل توجہ دہانیوں کے بعد اتنی کارروائی ہوئی کہ ۱۹۶۸ء میں ایک اردو ٹرانسلیٹر اور ایک اردو ٹائپسٹ پر مشتمل 'اردو سیل' قائم کر دیا گیا۔ اس مختصر سیل کا قیام اسی صورت میں مفید ہوتا جب عام رجحان اور رویہ اردو کے موافق ہوتا اور صرف ترجمہ یا ٹائپ کی کمی ہی رکاوٹ ہوتی لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ اس طرح اردو سیل کے قیام سے اردو والوں کی شکایات تو حقیقتاً کچھ دور نہ ہوئیں۔ ہاں وقتاً فوقتاً انجمن ترقی اردو کی طرف سے یا انفرادی طور پر اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کی شکایات کا جواب دینے کے لئے حکومت کو ایک مستقل سہارا ضرور مل گیا۔ اور اب ہر ایک شکایت یہی کہہ کر ختم کر دی جاتی ہے کہ 'یہ درست نہیں کیونکہ ایڈمنسٹریشن میں ۱۹۶۸ء سے ایک اردو سیل قائم ہے جو اردو کے کام کاج کی دیکھ بھال کرتا ہے'۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۵۸ء کے لینگویج پر عمل درآمد کی نگرانی بھی اسی 'اردو سیل' کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ بغیر کسی افسر کی موجودگی یا دلچسپی کے صرف ٹرانسلیٹر اور ٹائپسٹ پر مشتمل یہ سیل کس طرح اس ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے جبکہ ہندی کا جسے خوش قسمتی سے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اس کے لئے بھی اعلیٰ افسروں کی طرف سے تاکیدی ہدایات جاری کرنا پڑتی ہیں، برابر سرکاری ملازموں کی توجہ دہانی کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، انھیں مختلف ترغیبات دی جاتی ہیں، ان کے کام کا ماہانہ جائزہ لیا جاتا ہے، اور اس سب کے لئے خاص طور پر کچھ افسر مقرر ہیں مگر پھر بھی مقصودی کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ یہ صورت حال سرکاری زبان ہونے کے باوجود ہے پھر بیچاری اردو جسے ثانوی زبان کا درجہ بھی حاصل نہیں اسے دی گئی مراعات کی طرف لوگ از خود متوجہ رہیں گے اور ۱۹۵۸ء کے لینگویج اسٹیٹمنٹ کی ہدایات پر کاربند رہیں گے' یہ کیسے ممکن ہے۔ در اصل ایک اردو افسر کے بغیر 'اردو سیل' عملی طور پر محض غیر مفید ہے۔ جب تک ایک اردو افسر اردو سیل کا باقاعدہ نگراں اور انچارج نہ ہوگا ۱۹۵۸ء کے لینگویج اسٹیٹمنٹ پر حقیقتاً عمل درآمد غیر ممکن سی بات ہے۔ ویسے کاغذی کارروائی کے طور پر جو بھی کہا جاتا ہے وہ درست ہے ورنہ اگر فی الحقیقت سرکار اردو جاننے والوں کو وہ سہولتیں و مراعات دینا چاہتی ہے جو ۱۹۵۸ء کے لسانی بیانیہ میں درج ہیں تو ایک اردو افسر مقرر کیا جائے اور ایڈمنسٹریشن میں ہندی صلاح کار بورڈ کے طرز پر ایک اردو صلاح کار بورڈ بھی قائم کیا جائے جو اردو کے کام کا جائزہ لے اور سرکار کو حسب ضرورت مشورے بھی دے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا اس وقت تک وہی تعطل رہے گا اور وہی الٹا جواب دینے کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اب بطور ثبوت اسی اجمال کی کچھ تفصیل بھی۔ ایڈمنسٹریشن کا محکمۂ تعلقات عامہ ایک ایسا ڈپارٹمنٹ ہے جس کا تعلق براہ راست عوامی زندگی سے ہے اور عام اطلاع کے لئے اشتہار کتابچے اور پریس نوٹ وغیرہ برابر جاری کئے جاتے رہتے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن کی خبریں اور اعلانات بھی اسی محکمہ سے پریس نوٹ کی صورت میں روزانہ اخبارات کو جاری ہوتے ہیں لیکن اب یہ پریس نوٹ اردو زبان میں نہیں بھیجے جاتے جس کے باعث اکثر پریس نوٹ اردو اخباروں میں شائع نہیں ہو پاتے جبکہ راجدھانی سے شائع ہونے والے روزانہ اخبارات میں اردو روزناموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ چند سال پہلے تک یہ صورت حال نہ تھی۔ ہر پریس نوٹ ہندی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں جاری کیا جاتا تھا لیکن اب اردو اخبارات کو بھی ہندی انگریزی کے پریس نوٹ بھیج دئے جاتے ہیں۔ دراصل پہلے وہاں ایک اردو ٹرانسلیٹر کی پوسٹ تھی جس پر تعینات شخص اردو ترجمہ کا کام انجام دیتا اور اس طرح تمام پریس نوٹ بغیر کسی دشواری کے اردو میں بھی جاری ہوتے پھر اس شخص کی کہیں اور تعیناتی ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا دوبارہ اس پوسٹ پر بھرتی کئے جانے کے بجائے اس پوسٹ ہی کو ختم کر دیا گیا۔

ایڈمنسٹریشن نے غالباً یہ پالیسی بنائی ہے کہ اگر اردو کی کوئی پوسٹ کسی طرح خالی ہو جائے تو جلد اس جگہ پر کسی شخص کی تقرری کے بجائے اس جگہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔

اسی طرح دلی ایڈمنسٹریشن سکریٹریٹ کے سروسز ڈپارٹمنٹ سے مختلف ملازمتوں کے لیے جو اشتہارات شائع کئے جاتے ہیں ان میں اردو زبان اور اردو اخبارات کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہر سال سیکڑوں جگہیں خالی ہوتی اور بھری جاتی ہیں جن کے اشتہار انگریزی و ہندی کے روزناموں میں شائع کئے جاتے ہیں لیکن اردو روزناموں میں ان کی اشاعت پر جیسے پابندی عائد کر دی گئی ہو۔ بھولے بھٹکے بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کلرکوں کی سالانہ بھرتی کا اشتہار ہی اردو میں شائع کرا دیا جائے تاکہ اردو جاننے والا طبقہ ناواقفیت اور محرومی کا شکار نہ رہے۔ یہ صورت حال وزارت داخلہ کے لینگویج اسسٹنٹ کے باوجود ہے جس میں واضح طور پر یہ ہدایت موجود ہے کہ عام اطلاع کے لئے جاری کئے جانے والے اطلاع نامے اور اشتہارات اردو زبان میں بھی جاری ہونے چاہئیں۔ ہمارے خیال میں یہ بے توجہی اور بے اعتدالی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایڈمنسٹریشن میں ایک اردو افسر نہ مقرر کیا جائے اور ایک اردو صلاح کار بورڈ نہ قائم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ۱۹۵۸ء کے لینگویج اسسٹنٹ کو قانونی شکل بھی دی جانی ضروری ہے۔

دہلی • خورشید نیر

کیا یہ شعر صفدر مرزاپوری کا ہے؟

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مدت دراز سے یہ شعر غالب کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ لیکن شہرت کا حقیقت پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شعر صفدر مرزاپوری کا ہے۔ ۲۲؍جون کے اخبار ہماری زبان میں جناب دادا بھائی کاؤس جی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اس خیال کی تصدیق مجھ سے چاہی ہے۔ جواب میں تحریر ہے کہ صفدر مرزاپوری کے قلمی دیوان میں اس زمین میں ۱۸ شعر کی ایک غزل موجود ہے مگر یہ شعر نہیں ہے۔ بظاہر اس سے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ شعر صفدر مرزاپوری کا نہیں ہے۔

لکھنؤ • سید مسعود حسن رضوی ادیب

الہامی کتاب؟

کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو الہامی کتاب کہہ کر ایک نئی بات پیدا کی تھی بعد میں ہماری زبان میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ خیال انھوں نے شیفتہ مرحوم سے لیا ہے۔ میرے خیال میں یہ مرزا غالب ہی کی اپج ہے، جس سے بجنوری نے استفادہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے

گر ذوق سخن بہ دہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر ایں فن سخن دین بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

امرتسر • شوداج بہار

فروغ اردو کا اظہار ممنونیت

کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام نشر کرانے کی تحریک کی کامیابی پر ادارۂ فروغ اردو شب پور ہوڑہ کو مبارکباد اور نیک خواہشات کے بہت سارے پیغامات موصول ہوئے ہیں ادارہ ہذا ان تمام اردو دوستوں اداروں اور اخبارات کا شکرگزار ہے جن کے پرخلوص تعاون سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

آخر میں ہم اردو دوستوں سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنے گرانقدر اور مفید مشورے ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کلکتہ اور مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نئی دہلی کو لکھ کر روانہ کر دیں، تاکہ یہ پروگرام بہتر سے بہتر، مستقل اور دلچسپ بن سکے۔

ہوڑہ • ایم۔ اے۔ قاسم (علیگ)

اخبار و افکار

لکھنؤ میں اردو کالج کے قیام کا منصوبہ

لکھنؤ: رفاہ عام ایسوسی ایشن کی عاملہ کے جلسہ میں اس بات کی توثیق کی گئی کہ لکھنؤ میں اردو ذریعہ تعلیم کے ایک کالج کا قیام تدریجی طور پر عمل میں لایا جائے۔

جلسہ ڈاکٹر فریدی کے مطب میں ہوا جس میں شیخ مقبول احمد لاری، مقبول الہٰی، مجتبیٰ صدیقی، عبدالمتین فرنگی محلی، ڈاکٹر خاں وغیرہ شامل تھے۔ لوگوں نے ضروری اخراجات کے لئے عطیوں کا وعدہ بھی کیا۔

اس سے پہلے رفاہ عام ایسوسی ایشن کی ایکزیکیٹیو کمیٹی کا ایک جلسہ اقبال منزل میں ڈاکٹر خاں کی صدارت میں ہوا تھا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ اردو میڈیم کے کالج کے قیام کے لئے پہلے پرائمری درجات سے ابتدا کی جائے جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو پھر رفتہ رفتہ ثانوی اور کالج کے درجات کھولے جائیں۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو میڈیم بورڈ کا قیام

کانپور: فیض عام انٹر کالج کانپور کے زیر اہتمام زیر صدارت جناب اکبر علی صاحب صدیقی پرنسپل کالج مذکور ایک جلسہ ہوا جس میں مندرجہ ذیل امور متفقہ طور پر طے پائے۔

(۱) کانپور میں ایک اردو میڈیم بورڈ قائم کیا جائے جس کا صدر دفتر صدیقی فیض عام انٹر کالج ہوگا۔

(۲) یہ بورڈ درجہ پنجم کا امتحان اردو میڈیم سے اپنی نگرانی میں کرائے۔

(۳) جن اداروں میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہے اور جو اپنی مادری زبان میں تعلیم دلانا چاہتے ہیں وہاں اس کی کوشش کی جائے گی کہ جولائی سنہ ۸۱ء سے اردو زبان ذریعہ تعلیم ہو۔

• سیاست کانپور

اردو نصاب کی کتابیں فراہم کرنے کا مطالبہ

لکھنؤ: مسلم مجلس کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے لوکل باڈیز کے ممبروں کی ایک میٹنگ یہاں الہ آباد میونسپل کارپوریشن کے ممبر جناب سمیع اللہ کی صدارت میں ہوئی۔

ایک قرارداد میں کہا گیا کہ حکومت تعلیمی اداروں کو جو داخلہ فارم سپلائی کرتی ہے اس میں مادری زبان کا خانہ نہیں ہوتا حالانکہ لسانی اقلیتوں نے بار بار اس کا مطالبہ کیا ہے، حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کی تلافی فوراً کرے۔

ان لوگوں کے لئے جو اردو ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اردو کی منظور شدہ کتابوں کے نہ دستیاب ہونے پر مجلس نے گہری تشویش ظاہر کی ہے اور اس امید کا اظہار کیا ہے کہ آنے والا تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ہی اس کمی کو دور کر دیا جائے گا۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو میں حلف لینے کی اجازت

لکھنؤ: وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی نے سرکاری ذمہ داروں کو ہدایت کر دی ہے کہ لوکل باڈیز کے جو ممبر اپنی مادری زبان اردو میں حلف لینا چاہیں ان کو اس کی اجازت دی جائے۔ ریاستی مسلم مجلس کے صدر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے بتایا ہے کہ انھوں نے تار کے ذریعہ مسلم مجلس کے ان تمام ممبروں سے اپیل کی ہے کہ جو مجلس سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ ممبری کا حلف اردو میں لیں۔ مسلم مجلس نے اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی کی یقین دہانی طلب کی تھی جو مل گئی ہے۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو صحافیوں کے فنڈ کے لئے بمبئی میں مشاعرہ

بمبئی: اردو نیوز پیپرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اردو صحافیوں کے فنڈ کے لئے ۲۰ر جون کو بمبئی کے کیسر باغ میں ایک تاریخی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا نے کی۔ اور رسم افتتاح فلم اسٹار دلیپ کمار نے انجام دی۔ اس مشاعرے کی کامیابی کا اندازہ اردو نیوز پیپرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری شہریار عابدی کے اس اعلان سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ مشاعرہ سے تقریباً (۶۰ تا ۷۰) ہزار روپے کی آمدنی ہوئی۔ دلیپ کمار نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اردو کی ترویج و ترقی میں درپیش بعض مشکلات کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ارباب مجاز اس زبان کے تاریخی رول، افادیت اور اہمیت کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن جب مالی مدد کا مرحلہ آتا ہے تو مجبوری کے اظہار پر قناعت کر لی جاتی ہے۔ دلیپ کمار نے یقین دلایا کہ اردو کی نشو و نما اور ترقی کے لئے ان سے جو بھی خدمت بن پڑے گی انجام دینے میں گریز نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر رفیق ذکریا نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو صحافت کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات صحیح معنوں میں ہماری امیدوں اور مایوسیوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جنگ آزادی کے دوران اردو کے شاعروں ادیبوں، اور صحافیوں کی گرانقدر خدمات کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ مولانا آزاد اور قاضی عبدالغفار نے جو روایات چھوڑی ہیں ان پر

اردو دوسری بڑی زبان

بمبئی مہاراشٹر سرکار کے ڈائرکٹر آف پبلسٹی کی طرف سے جاری ہونے والے گزٹ کے بموجب صوبہ مہاراشٹر میں اردو دوسری سب سے بڑی زبان ہے پہلے نمبر پر مرہٹی زبان ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد ۳ کروڑ ۲۳ لاکھ ۳۳ ہزار ۲ ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد ۲۷ لاکھ ۲۵ ہزار ۹ سو ۸۹ ہے تیسرے نمبر پر گجراتی زبان ہے جبکہ ہندی کا نمبر چوتھا ہے۔

• الجمعیۃ دہلی

نظم و نسق کی سطح پر اردو کے استعمال کا مطالبہ

ریاست آندھرا پردیش کے تمام سرکاری محکمہ جات میں یکم اگست ۱۹۹۱ء سے تلگو کے ساتھ ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کو بھی نظم و نسق کی سطح پر استعمال کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ریاستی اشک کے قائدین نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ ریاستی حکومت کی جانب سے قانون ساز اسمبلی اور اس کے باہر کئی بار یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ جب تلگو کو اس کا سرکاری مقام دیا جائے تو اس کے ساتھ ہی اردو کو بھی سرکاری درجہ دیا جائے گا۔ اس خصوص میں حکومت کی جانب سے ۱۵ رجون کو مختلف سرکاری محکمہ جات میں تلگو زبان میں اعلانات اور احکامات اور معاہدہ وشنیدوں اور دیگر خط و کتابت کے لئے یکم اگست سے تلگو زبان میں کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن اس میں اردو کے رائج کرنے کے تعلق سے کوئی ہدایت نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے مشترکہ بیان میں ملک کی تمام ریاستوں میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے تعلق سے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے حالیہ تیقن کا خیر مقدم کیا گیا اور توقع ظاہر کی گئی کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی خصوصی توجہ کے ذریعہ پورے ملک میں اردو کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

• نامہ نگار

گلبرگہ (میسور) کے مدارس اور اردو

مستقر گلبرگہ کے تحتانی، وسطانی اور فوقانی مدارس میں اردو داں اساتذہ کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے اردو جماعتوں کے حالات اطمینان بخش نہیں ہیں ہر جماعت میں (۹۰) طلبہ شریک کئے جاتے ہیں اور بعد داخلہ نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کے باعث بیشتر طلبہ تعلیم سے محروم ہیں۔ اکثر مدارس میں اردو تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ موجود ہیں جو خود اردو سے بخوبی واقف نہیں۔ اس سلسلہ میں مومن پورہ، آصف گنج، شاہ بازار وغیرہ کے مدارس قابل توجہ ہیں۔ جہاں پر اردو اساتذہ کی کمی ہے گورنمنٹ ٹاؤن پریمری ہائی اسکول گلبرگہ میں (۲) سال کے دوران اردو کی جماعتیں (۸) سے گھٹ کر (۲) ہوگئیں۔ اس سال کئی طلبہ کو اردو کی ابتدائی جماعت میں داخلہ نہیں مل سکا ہے۔ علاوہ ازیں سال رواں کے لئے اردو ٹریننگ کلاسیں بھی موجود نہیں۔ ارباب تعلیمات حکومت میسور سے گزارش ہے کہ وہ گلبرگہ کے مدارس میں اردو جماعتوں کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے اردو اساتذہ کا تقرر اور ممکن ہو سکے تو اردو انسپکٹروں کا تقرر عمل میں لائے اس طرح اردو کے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔

• نامہ نگار

سرکاری مدارس سے اردو جماعتوں کی برخاستگی پر تشویش

حیدرآباد: اردو کی مختلف انجمنوں، نوجوانوں اور طالب علموں کے اداروں کے قائدین نے شہر حیدرآباد اور اضلاع کے سرکاری مدارس سے اردو جماعتوں کی برخاستگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے اپیل کی کہ وہ اپنی لسانی پالیسی پر نظر ثانی کرے اور اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتوں کو برخاست کرنے کی بجائے ان میں اضافہ کرے۔ مشترکہ بیان میں بتایا گیا ہے کہ نئے تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ہی مختلف جماعتوں سے اردو کلاسس کو ختم کر دیا گیا ہے حال ہی میں سٹی ہائی اسکول سے بھی اردو کی آٹھویں کلاس کو ختم کر دیا گیا ہے اس طرح یکے بعد دیگرے مختلف مدارس سے اردو کی کلاسس کو ختم کر دینے سے اردو داں طالب علموں میں تشویش پیدا ہو گئی ہے مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ ایک طرف حکومت اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے اقدامات کر رہی ہیں تو دوسری طرف نظم و نسق کی سطح پر اردو کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے تعلیمی اور حکومت کی مشنری میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے مرکزی حکومت کو فوری توجہ کرنی چاہئے۔

• سیاست حیدرآباد

حکومت کی طرف سے راجستھان میں اردو کی ترقی کے لیے کمیٹی کا قیام

معلوم ہوا ہے کہ حکومت راجستھان نے اردو زبان کی شکایات دور کرنے اور اس کی ترقی کے لئے سرکاری سطح پر ایک کمیٹی تشکیل کر دی ہے۔ اس کمیٹی میں جہاں چیف سکریٹری صاحب اور سکریٹری برائے محکمہ تعلیمات شامل ہیں، وہاں غیر سرکاری ممبران میں جناب شیخ چاند بہاری لال صبا جناب نواب صاحب لوہارو وزیر برائے پی ڈبلو ڈی کے چچا مرزا افضال الدین صاحب اور انجمن ترقی اردو کے نمائندے جناب افتخار علی شمیم کو بھی منتخب کیا گیا ہے یاد رہے کہ حکومت راجستھان نے خیری صاحب سابق صدر انجمن ترقی اردو اور مرحوم مولوی احترام الدین صاحب شاغل کی کوششوں سے ایسی ہی ایک کمیٹی پہلے بھی تشکیل کی تھی جو صرف کاغذوں تک محدود رہی عملی طور پر کچھ نہ کر سکی۔ اب حکومت نے دوبارہ اس کمیٹی کو تشکیل کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ یہ کمیٹی اردو کی بقا کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی خدا کرے کہ یہ کمیٹی سابقہ کمیٹی کی طرح بے عمل ثابت نہ ہو بلکہ عمل کے میدان میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دے کر دکھائے۔ آج راجستھان میں اردو والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔ متعدد شہروں میں اردو والوں کی بڑی تعداد اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اردو اساتذہ اور کورس کی کتابوں کے فقدان کے سبب وہ ایسا نہیں کر پاتی اس لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست کرے اور اردو کی جو شکایات ہیں ان کو دور کرے۔ اردو زبان آزادی سے پیشتر راجستھان کی اکثر ریاستوں میں سرکاری زبان رہی ہے۔ جن غیر سرکاری ممبران کو اس کمیٹی میں شامل کیا گیا ہے ان کا فرض اولین ہے کہ ریاستی حکومت کو اردو کی صحیح پوزیشن سے باخبر کریں اور ذاتی منفعت کو بالائے طاق رکھ کر اردو کی بقا اور ترقی کے لئے سچے دل سے کوشش کریں۔

• بہ لا ہوا زمانہ جے پور

ٹونک میں "بزم ادب" کا قیام

یہاں چند شعرائے کرام اور ارباب ذوق نے اردو کی ترویج و اشاعت کے پیش نظر "بزم ادب" کے نام سے ایک علمی شعری و ادبی انجمن قائم کی ہے علاوہ ممبران کے مندرجہ ذیل عہدیداران منتخب ہوئے ہیں۔

سرپرست: مولانا عبدالحی صاحب فارؔ، صدر: محمد عبدالبصیر صاحب بصیرؔ، نائب صدر: صاحبزادہ معز الدین خاں دلدارؔ، ناظم: احمد انور صاحب، ناظم مشاعرہ: خالد صاحب سحرؔ۔ بزم کے اغراض و مقاصد میں شعرائے کرام کو تعمیری راہ پر گامزن کرنا مقصود ہے۔

• حبیب الرحمٰن حامد

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

عتیق احمد صدیقی

نام کتاب: مشاہیر کے اولین صحیفے

مرتب: عابد رضا بیدار
ناشر: رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز
سن اشاعت: ۱۹۷۰ء

۱۰۴ صفحات کی یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں پر مشتمل ہے:

۱۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	بابی مذہب	بابی مذہب کی تاریخ اور عقائد
۲۔	مولانا ابوالکلام آزاد	اعلان الحق	رویت ہلال سے متعلق مسائل پر بحث
۳۔	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی		حوادث سمرنا کے متعلق اتحادی کمیشن کی رپورٹ
۴۔	مولانا محمد حسین آزاد	رسالۂ نکاح	نکاح سے متعلق مسائل

ابوالکلام آزاد کی تحریر کو چھوڑ کر باقی مشاہیر کی تحریریں ترجمے ہیں جو انگریزی اور فارسی سے کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا مودودی کے ترجمے انگریزی سے ہیں اور محمد حسین آزاد کا فارسی سے۔ محمد حسین آزاد نے ترجمہ کو خاصا لفظی بنا دیا ہے جیسا کہ اس سے پیشتر علما کے اکثر ترجموں اور تحریروں کا انداز ہوتا تھا۔ ترجمے ہونے کے باعث ان تحریروں سے شخصی اسلوب کا رشتہ نہیں جوڑا جا سکتا کہ ان تحریروں کے ذریعہ ان حضرات کے اسلوب تحریر کے ارتقا پر کوئی روشنی پڑ سکے یہی اس کتاب کی وجہ جواز ہو سکتی تھی۔

یہ تحریریں جیسا کہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان مصنفین کی ۱۱ تا ۱۸ سال کی عمر کی کاوشیں ہیں۔ اس میں سے اول ناقابل یقین حد تک کم عمری کا سن ہے، خاص کر کسی عالمانہ تحریر کے لئے اور وہ بھی ایک نزاعی مسئلہ کے بارے میں۔

ہر تحریر کے آغاز میں مرتب کتاب کی طرف سے تعارف و تبصرہ لکھا گیا ہے جس میں نفس مضمون کے موضوع بھی زیر بحث آئے ہیں، ترجمہ کے بعض تسامحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض پتہ کی باتیں کہی گئی ہیں۔

ان تحریروں میں سے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کے اصل رسالوں کے لوح بھی دئے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک پر دو دو آنے قیمت درج ہے۔ دو اور مضامین کا اضافہ کر کے کل صفحات ۱۰۴ ہوئے۔ ان میں سے بھی چند صفحات سادہ ہیں اور کتاب کی قیمت بیس روپے رکھی گئی ہے۔ جو بہت زیادہ ہے۔

تبصرہ

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

کربل کتھا کا لسانی مطالعہ

از خلیق انجم و گوپی چند نارنگ
شائع کردہ مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی
قیمت چار روپے

لسانی تجزیہ کا عمل جتنا مشکل ہے اتنا ہی نازک بھی ہے۔ یہاں ادنیٰ ترین لغزش بھی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ کاتب کے تصرفات متن کو کس حد تک مسخ کرسکتے ہیں اس کے بیان کی احتیاج نہیں ہے۔ آتا کو آوتا، تو کو توں، کل کو کلہ، بڑھیا کو بوڑھیا، بوڑھیا، بوڑھی، بوڑھی یا بڈھی لکھ دینا تو نہایت معمولی باتیں ہیں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے ان کی جو اہمیت ہے لسانیات کا معمولی طالب علم بھی شاید اس کا اندازہ کرسکتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطے نہایت شاذ ہیں اس لئے ان معاملات میں جتنی احتیاط کی ضرورت ہے ظاہر ہے۔ اول تو مطبوعہ متن میں بالعموم مخطوطے کے املائی خصوصیات باقی نہیں رہتی ہیں پھر مخطوطے کے متن ہی کا کیا اعتبار کہ وہ مصنف کے املا اور تلفظ سے کس حد تک ہٹ چکا ہے۔ چنانچہ مطبوعہ متن کی بنیاد پر جو لسانی تجزیہ ہوگا اسے اصل (مصنف کی زبان و بیان) سے جو تعلق ہوسکتا ہے ظاہر ہے۔

فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" کو شمالی ہند کی اردو نثر کے قدیم ترین نمونوں میں بعض اعتبار سے خصوصیت حاصل ہے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کے بعد سے یہ کتاب نایاب ہو گئی تھی ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس کتاب کا ایک نسخہ جرمنی میں دریافت کیا، اسے نہایت محنت و کاوش کے ساتھ مرتب کیا اور جناب مالک رام کے تعاون سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ" کے عنوان سے ایک بہت وقیع مضمون سہ ماہی "اردو" کراچی کے اپریل ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ زیر تبصرہ کتاب "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" کی تکمیل میں جیسا کہ سرورق سے ظاہر ہے ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی تعاون کیا۔ علاوہ ازیں اس وقت ان صاحبوں کے پیش نظر کربل کتھا کا دوسرا (قدیم تر؟) ایڈیشن (پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کربل کتھا کو اب سے تقریباً دس سال پہلے شائع کرچکے تھے) بھی تھا لیکن نہایت حیرت ہے کہ یہ کتاب نارنگ صاحب کے مذکورہ مضمون کے مقابلے میں بہت ہلکی ہے۔ اس کا سبب غالباً یہی ہوا ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لئے تیار کی گئی ہے اس میں ٹھوس فنی بحثوں کو انتہائی حد تک آسان بنا دیا گیا ہے اور اس طرح کتاب مبتدیوں کے لئے دلچسپ اور مفید تر ہوگئی ہے۔

"کربل کتھا" کے سلسلے میں دو باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ اس کی بابت کہا گیا ہے کہ یہ "دلی کی مجلسوں میں سنائی جاتی تھی"۔ مجھے اس کے قبول کرنے میں تامل ہے، مختار الدین صاحب، مالک رام صاحب اور خود ڈاکٹر نارنگ صاحب کے جائزہ کے مطابق فضلی کی زبان میں پنجابی اثرات کافی ملتے ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ وہ پنجاب ہی کے علاقے کا رہنے والا ہو اور وہیں اس نے یہ کتاب لکھی ہو، درگاہ قدم شریف کا ذکر کرنے سے یہ ثابت نہیں کہ کتاب بھی دلی میں لکھی گئی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نقل ثانی کا سال ۱۱۷۰ھ بتایا گیا ہے۔ تاریخی شعر اس طرح لکھا ہے ؎

ہر کس از من کند بہ نیکی یاد
بہ جہاں ناشش ہم بہ نیکی یاد

مصرعۂ ثانی میں بدیہی طور پر کاتب نے سہواً "باد" کو ایک نقطے کے اضافہ کے ساتھ "یاد" بنا دیا ہے۔ شعر میں "بہ" تین بار آیا ہے اور اس طرح پہلے مصرع سے ۵۶۹ اور دوسرے سے ۶۰۶ کے عدد برآمد ہوتے ہیں ۱۱۷۰ کے عدد شعر سے اسی صورت میں نکلیں گے جب کسی ایک "بہ" کو لفظ مابعد سے ملا کر لکھیں اور ہائے ہوز کے عدد شمار میں نہ لائیں۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

بہر حال زیر تبصرہ یہ کتاب طلبہ کی رہنمائی کے لئے لکھی گئی ہے امید ہے کہ یہ کما حقہٗ مفید ثابت ہوگی اور "کربل کتھا" کی لسانی اہمیت کی تفہیم میں طلبہ کو اس سے خاطر خواہ مدد ملے گی۔ لسانیاتی بحثوں کو اس حد تک سادہ اور عام فہم انداز سے پیش کرنے کے لئے ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ و پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD-No. L. 922　فون نمبر ۲۹　R-NO. 2186/57